"پردہ" پر ایک اعتراض اور اس کا جواب

"..... کالج کے ایک ہندو پروفیسر صاحب کو میں نے آپ کی کتاب "پردہ" پڑھنے کو دی تھی۔ اس کے جواب میں انھوں نے جو خط لکھا ہے وہ آپ کو بھیجتا ہوں۔ اگرچہ ان کے سوالات کا جواب ہم بھی دے سکتے ہیں لیکن آپ خود جواب دینے کی تکلیف فرمائیں تو یہ ان کے لیے زیادہ تسلی بخش ہوگا۔"

جس خط کا حوالہ دیا گیا ہے وہ انگریزی میں ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے:

"آپ نے جو کتاب مجھے دی تھی اسے میں نے ختم کر لیا ہے۔ میں نے اسے بہت غور سے پڑھا اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میں بڑی حد تک مصنف کے خیالات سے متفق ہوں۔ مگر ہندو سوسائٹی میں ہندو عورتوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا جاتا ہے اس پر مصنف کی رائے زنی ہندو رسم و رواج سے ناواقفیت پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو قوم سیاسی حیثیت سے گر گئی ہو اس کے اندر بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور ہندو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں، تاہم کسی ہندو خاندان میں عورت کو لونڈی کی حیثیت نہیں دی جاتی جیسا کہ مصنف نے ایک جگہ بیان کیا ہے بلکہ اس کے برعکس ایک بیوی کی طرح اس کی عزت و حرمت ملحوظ رکھی جاتی ہے

مگر آپ کو یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ انسانی سوسائٹی کوئی جامد چیز نہیں ہے بلکہ ایک نامی چیز ہے۔ وہ ہمیشہ تغیر قبول کرتی رہتی ہے، خواہ یہ تغیر بہتری کی جانب ہو یا بدتری کی جانب۔ ہمارے رواج، آداب و اطوار، زبان، لباس، خیالات وغیرہ ہم بدلتے رہتے ہیں۔ ہمارے بچوں کا ہمارے نقش قدم پر چلنا کچھ ضروری نہیں ہے۔ غالباً وہ غلطیاں کرنے کا حق بھی مانگتے ہیں۔ میں چونکہ ایک آزاد خیال آدمی ہوں اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے کا حق ہے، اور یہی حق ایک عورت کو بھی ہے۔ پھر کیوں اس سے مطالبہ کیا جائے بلکہ بزور اسے مجبور کیا جائے کہ وہ چہرے پر نقاب ڈالے؟ مصنف نے

اپنے دعاوی کی تائید میں مغربی مصنفین کی تحریریں نقل کی ہیں، مگر یہ زیادہ بہتر ہوتا کہ وہ گجرات، مہاراشٹر اور مدراس کی سیاحت کرتا اور خود تحقیق کرتا کہ آیا ان صوبوں کی عورتیں جنھوں نے صدیوں سے کبھی پردہ نہیں کیا ہے، کسی اخلاقی پستی میں مبتلا ہیں؟"

پروفیسر صاحب کی طرح غالباً بہت سے دوسرے ہندو بھائیوں نے بھی میری کتاب کو ملاحظہ فرمایا ہوگا اور ممکن ہے کہ ان کو بھی یہ بات بُری لگی ہو گی جس کی شکایت پروفیسر صاحب نے کی ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں پبلک میں اپنے مدعا کی تشریح کردوں۔ ہندو سوسائٹی میں عورتوں کی حیثیت کے متعلق میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے میری مراد وہ برتاؤ نہیں ہے جو ہمارے ہندو بھائی عملاً اپنے گھروں میں اپنی بیویوں، بہنوں، ماؤں اور بیٹیوں کے ساتھ کرتے ہیں، بلکہ وہ حیثیت ہے جو ہندو قانون اور فلسفۂ اجتماع نے عورتوں کو دی ہے۔ اس چیز کا میں نے جس حد تک مطالعہ کیا ہے، میں کسی تعصب کے بغیر اس سے وہی نتیجہ اخذ کر سکا ہوں جو پروفیسر صاحب نے میری کتاب میں ملاحظہ فرمایا، اور میرا خیال ہے کہ خود ہندوؤں میں بھی جو حضرات اصلاحِ معاشرت کے لیے کوشش کر رہے ہیں ان میں سے اکثر اپنی سوسائٹی میں عورتوں کی قانونی، معاشی اور معاشرتی حیثیت کو قابلِ اطمینان نہیں پاتے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ بہت سی خرابیاں اس انحطاط کا نتیجہ ہیں جس میں ہندو قوم صدیوں تک مبتلا رہی ہے، لیکن آخر ان کی اصلاح کیسے ہو سکتی ہے جب تک کہ جرأت کے ساتھ ان کو محسوس اور متحقق نہ کیا جائے؟ میں نے اپنی کتاب میں صرف ہندوؤں ہی پر نہیں بلکہ موجودہ زمانہ کی مسلمان قوموں پر بھی نکتہ چینی کی ہے، اور مغربی اقوام پر تو میری تنقید بہت سخت ہے، مگر کسی قوم کے معاملہ میں بھی میری تنقید کا مقصد تحقیر اور عیب چینی نہیں ہے بلکہ صرف یہ ہے کہ ہر ایک کو اس غلطی پر متنبہ کروں جس میں وہ مبتلا ہے اور اس اصلاح کی طرف توجہ دلاؤں جس میں مجھے اس کی فلاح نظر آتی ہے۔

پروفیسر صاحب کی طرح میرا بھی یہی خیال ہے کہ سوسائٹی کوئی جامد چیز نہیں ہے بلکہ نشوونما اور تغیر قبول کرنے والی چیز ہے۔ اور یہ بات خود پروفیسر صاحب نے تسلیم فرمائی ہے کہ تغیر لازماً صحیح ہی نہیں ہوتا، غلط بھی

ہوتا ہے۔ اب یہ سمجھنے سے میں معذور ہوں کہ انسانی سوسائیٹی یا اس کے افراد اگر غلط سمت میں تیز قبول کر رہے ہوں تو انھیں ٹھوکریں کھانے اور تباہی و نقصان کی طرف جانے کے لیے کیوں چھوڑ دیا جائے؟ کیوں نہ صحیح سمت کی طرف ان کی رہنمائی کی جائے؟ خصوصاً جو شخص جانتا ہو کہ صحیح سمت کونسی ہے وہ اگر لوگوں کو غلط سمت میں بڑھتے ہوئے دیکھ کر خاموش بیٹھا رہے تو اس کے مجرم ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ میں آزادی کے اس مفہوم کو کبھی نہیں سمجھ سکا ہوں کہ آدمی کو حماقت اور خودکشی اور سوسائیٹی کی تخریب کے لیے بھی آزاد ہونا چاہیے۔

"بلکہ بزور اُسے مجبور کیا جائے کہ وہ چہرے پر نقاب ڈالے"، پروفیسر صاحب کا یہ فقرہ بڑا دلچسپ ہے۔ اگر جبر سے مراد مار پیٹ کر زبردستی نقاب ڈلوانا ہے تو میں پروفیسر صاحب کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ واقعہ کبھی پیش نہیں آیا ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی پیش نہ آئے گا۔ البتہ اگر زور اور جبر سے مراد سوسائیٹی کی رائے اور اس کے رائج کردہ طریقوں کی طاقت ہے، تو میں کہتا ہوں کہ اجتماعی زندگی اس طاقت کے استعمال سے کبھی خالی نہیں رہی ہے اور نہ کبھی خالی کی جا سکتی ہے۔ سوسائیٹی کا لفظ اُس روز ہر معنی سے خالی ہو جائے گا جس روز وہ اس طاقت اور اس کے استعمال سے خالی ہو جائے گی۔ یہ آج کل کی "آزاد خیال" سوسائیٹی جس میں ہر شخص ایک دوسرے سے بڑھ کر آزاد خیالی کا مدعی اور آزادیِ رائے کے احترام کا دعوے دار ہے، اس کے دعووں کی حقیقت ایک ذرا سی آزمائش سے کھل سکتی ہے۔ ابھی کوئی شخص اس سوسائیٹی میں ڈاڑھی رکھ لے، پھر آپ خود دیکھ لیں گے کہ اسے کس کس طرح شرمندہ کیا جاتا ہے اور کیسے کیسے فقرے اس پر کسے جاتے ہیں۔ یہ تجربہ آپ جب چاہیں کر سکتے ہیں، اس سے آپ کو بآسانی اس بات کا ثبوت مل جائے گا کہ "آزاد خیالی" کے اس دور میں بھی سوسائیٹی کی فطرت نہیں بدلی ہے۔ وہ آج بھی افراد کی "آزادیِ خیال" کے مقابلہ میں اپنی اجتماعی پسند اور اپنے اجتماعی معیارِ تہذیب و ثقافت کو اسی جبر و زور کے ساتھ مسلط کر رہی ہے جس طرح ہمیشہ سے کرتی چلی آ رہی تھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جب پرانی سوسائیٹی کے کسی شخص میں ان "آزاد خیال" حضرات کے منشاء کے مطابق تغیر رونما ہوتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ کسی کو اس پر ملامت کرنے کا حق نہیں ہے، ہر شخص کو اپنے عمل میں آزاد ہونا چاہیے۔ سوسائیٹی کون ہوتی ہے کہ ایک آدمی کو

وہ طریقہ اختیار کرنے سے منع کرے جسے اُس نے خود اپنے لیے پسند کیا ہے۔ لیکن اگر نئی سوسائیٹی کے کسی شخص میں ان کے منشا کے خلاف تغیر واقع ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ کوئی آزاد خیال عورت پردے کو خود پسند کر کے نقاب اوڑھ لے، یا کالج کا کوئی طالب علم "ملائیت" اختیار کر کے ڈاڑھی اور نماز کا پابند ہو جائے اور سینما اور برج اور دوسرے بیہودہ افعال سے پرہیز کرنے لگے۔ تو یہی "آزاد خیال" سوسائیٹی پوری "دقیانوسیت" اور "تاریک خیالی" کے ساتھ وہ سب تدابیر اُس کے اِس تغیر کو روکنے اور اسے اپنے سابق طریقے کی طرف پھیر لانے کے لیے استعمال کرتی ہے جو پرانی سوسائیٹی استعمال کیا کرتی تھی۔ بلکہ ٹرکی اور روس کے "آزاد خیالوں" نے تو اس بیسویں صدی میں "دقیانوسیت" کی حد کر دی ہے۔ "آزاد خیال" کے ان متعصب دشمنوں نے اُن عورتوں کے نقاب زبردستی نوچ نوچ کر پھینک دیے ہیں جو بے نقاب ہونا نہ چاہتی تھیں، اُن لوگوں کو زبردستی ہیٹ پہنوائے ہیں جو اپنے سروں پر پگڑی رکھنا چاہتے تھے، پوری پوری آبادیوں کو لاطینی رسم الخط اختیار کرنے پر از روئے قانون مجبور کیا ہے جو عربی یا فارسی رسم الخط کی پابند رہنا چاہتی تھیں۔

پروفیسر صاحب کا آخری مشورہ قابلِ قدر ہے، مگر وہ مجھ سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہیں اس لیے شاید انھوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ میں تمام عمر کسی پرانے مسلمان خاندان کے ماحول میں گھرا رہا ہوں اور پھر کتابوں کے مطالعہ سے کچھ رائیں میں نے قائم کر لی ہیں۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مجھے دنیا کو آنکھوں سے دیکھنے اور قریب سے دیکھنے کا اچھا خاصا موقع ملا ہے۔ گجرات، دکن، مہاراشٹر اور شمالی ہند میں بھی میں نے قریب قریب تمام طبقوں کے اندرونی و بیرونی حالات کا مشاہدہ کیا ہے اور انہی مشاہدات نے مجھ کو بالآخر اس بات کا قائل و معترف بنا دیا کہ سوسائیٹی کی اخلاقی صحت اور صالح نشوونما کے لیے معاشرت میں اُن حدود کی پابندی ضروری ہے جو اسلام نے تجویز کی ہیں۔ ورنہ ایک زمانہ تھا جبکہ میں خود پردے کا مخالف تھا، حتیٰ کہ میں نے مصر کے ایک آزاد خیال شخص کی کتاب کا ترجمہ بھی کیا تھا جس میں اس نے "آزادیِ نسواں" کی پرزور حمایت کی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ ترجمہ شائع نہیں ہوا، بلکہ اس کا مسودہ بھی صفحۂ ہستی سے ناپید ہو گیا اور

اس طرح میں خلق خدا کی گمراہی کا سبب بننے سے بچا لیا گیا۔ میں نے یہ بات کبھی نہیں کہی، اور نہ ایسی بات کہنے کے لیے تیار ہوں کہ جن طبقوں میں زنانہ اور مردانہ سوسائٹی کے درمیان حد بندیاں کم ہیں یا بالکل نہیں ہیں وہ سب اخلاقی پستی میں مبتلا ہیں، مگر اپنے مشاہدات کی بنا پر مجھے اس بات کا پختہ یقین ہے کہ ایسے طبقوں سے اخلاقی پستی قریب تر ہے اور ان کے اس میں مبتلا ہو جانے کے امکانات زیادہ ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ جہاں پولیس کا انتظام نہیں ہے وہاں سب چور اور ڈاکو ہی بستے ہیں، مگر یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ وہاں چوری اور ڈاکے کا ارتکاب آسان تر ہے اور بدامنی پھیل جانے کے امکانات زیادہ ہیں۔ اجتماعی زندگی میں افراد کے اندر اخلاقی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا جتنی اہمیت رکھتا ہے، اتنی ہی اہمیت ایسے خارجی حدود و ضوابط کی بھی ہے جن سے افراد کو اخلاقی ذمہ داری کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرنے سے محفوظ رکھا جا سکتا ہو۔ جو سوسائٹی اپنے نظم کو برقرار رکھنے کے لیے ان دونوں تدبیروں میں سے محض کسی ایک تدبیر پر اکتفا کرتی ہے وہ اپنے آپ کو ایک دائمی خطرے میں مبتلا رکھتی ہے۔

تاریخ بنی اسرائیل کے متعلق چند اشکالات

سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۹۵ پر آپ لکھتے ہیں: "پہلا جزء یہ ہے کہ انسان کو بالعموم اللہ کی حاکمیت واقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے اور اس کے بھیجے ہوئے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنانے کی دعوت دی جائے۔ دعوت عام ہونی چاہیے اور اس کے ساتھ دوسری غیر متعلق چیزوں کی آمیزش نہ ہونی چاہیے ......" کیا دعوتِ توحید کے ساتھ رہائی بنی اسرائیل کا مطالبہ جو حضرت موسیٰ نے کیا غیر متعلق چیز نہ تھی؟

پھر آپ لکھتے ہیں: "دوسرا جزء یہ ہے کہ جتھا ان لوگوں کا بنایا جائے جو اس دعوت کو جان بوجھ کر اور سمجھ کر قبول کریں، اور جو بندگی و اطاعت کو فی الواقع اللہ کے لیے خالص کر دیں"۔ کیا سب بنی اسرائیل ایسے ہی تھے؟ کیا ان کے اعمال سے ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے؟ کیا فرعون کے غرق ہونے سے پہلے ان میں سے کسی